ترجمہ وتلخیص

امام مالک بن انسؒ اور ان کی تصنیف الموطأ

ڈاکٹر محمد کامل حسین

ترجمہ ڈاکٹر منور حسین

انسانی تاریخ کی یہ قدیم روایت رہی ہے کہ وہ اپنے عظیم لوگوں کے احوال وکوائف دریافت کرتی ہے اور انھیں محفوظ رکھتی ہے۔ یہ عظمت انھیں اس وجہ سے حاصل ہوتی ہے کہ وہ انسانی زندگیوں پر انمٹ نقوش ثبت کرتے ہیں بالخصوص ایسے لوگوں کے حالات وکیفیات ضرور ہی معلوم کیے جاتے ہیں جنھوں نے دینی عقائد واحکام میں کوئی مرتبہ امتیاز حاصل کیا ہو اس لیے کہ یہ عقائد ہی ہمیشہ سے انسانی معاشرہ کے قیام وبقا کا اہم ترین ذریعہ رہے ہیں۔

مسلمانوں نے بھی اپنی عظیم دینی وملی شخصیات کی سیرت وسوانح کو محفوظ کرنے کا خاصا اہتمام کیا ہے۔ چنانچہ سیرت وسوانح اور طبقات ومناقب کا جو عظیم ذخیرہ مسلمانوں کے یہاں ملتا ہے دنیا کی کسی قوم کے پاس اس کی نظیر نہیں ہے۔

حضرت امام مالک کی شخصیت اس اعتبار سے بہت ممتاز ہے کہ جب سے فقہ مالکی متعارف ہوئی ہے اور ان کی کتاب الموطأ لوگوں کے سامنے آئی۔ اس وقت سے سیرت نگاروں نے ان کی شخصیت وسیرت کو سب سے زیادہ قابل اعتنا گردانا ہے۔ اسی طرح ان کی کتاب الموطأ کا شمار بھی ان عظیم تصانیف میں ہوتا ہے جن کی روایت اور شرح وتعلیق کی طرف اہل علم نے سب سے زیادہ توجہ کی ہے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود ابھی تک نہ ان کی سیرت کا حق ادا ہو سکا ہے اور نہ ہی الموطأ کی خدمت کا چنانچہ اس بات کی ضرورت ہے کہ امام مالک کی شخصیت کا مختلف پہلوؤں سے بامعان نظر مطالعہ کیا جائے۔ امام مالک کا خاندان کیسا تھا؟ جاہلیت اور اسلام میں اس کا مرتبہ کیا تھا؟ امام مالک کی زندگی کیسی تھی؟ جس معاشرے کے وہ فرد تھے اس کی سیاسی، مذہبی اور اقتصادی حالت کیا تھی؟ امام مالک کے اساتذہ کون تھے؟ ان کی رایوں پر ان اساتذہ کے کیا اثرات پڑے؟

امام مالک کے شاگردوں کی تعداد کتنی تھی؟ اور ان کا مسلک کس طرح پھیلا؟ میں اس مضمون میں انتہائی اختصار کے ساتھ اپنے مطالعہ کا ماحصل پیش کرتا ہوں۔

نسب

امام مالک کی ولادت صحیح ترین قول کے مطابق ۹۳ھ میں ہوئی۔ والد کی طرف سے ان کا نسب دور جاہلیت کے قبیلہ حمیر سے جا ملتا ہے۔ ان کے پر دادا ابو عامر بن عمرو کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ صحابی تھے اور بدر کے سوا تمام غزوات میں رسول کریم کی معیت کا شرف انھیں حاصل ہوا اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد اسلام لائے تھے۔ اسی اختلاف کی بنیاد پر ان کے دادا مالک بن ابی عامر کے بارے میں بھی رائیں مختلف ہوگئی ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ وہ اس خاندان کے پہلے فرد ہیں جنھوں نے یمن سے حجاز کا سفر کیا اور ان کا شمار ان تابعین میں ہوتا ہے جنھوں نے صحابہ کرام سے احادیث کی روایت کی اور انھیں عہد عثمانی میں قرآن مجید کی کتابت کا شرف بھی حاصل ہوا۔

اساتذہ و شیوخ

امام مالک نے بہت چھوٹی عمر ہی سے حصول علم کا آغاز کیا چنانچہ علماء مدینہ کی ایک بڑی تعداد سے آپ نے کسب فیض کیا آپ کے اساتذہ میں سے جس شخصیت نے آپ کی علمی و فکری شخصیت کی تشکیل میں سب سے نمایاں کردار ادا کیا ان کا نام نامی ابوبکر عبداللہ بن یزید (متوفی ۱۴۸ھ) ہے جو ابن ہرمز کے نام سے معروف ہیں۔ امام مالک کہتے ہیں کہ میں ابن ہرمز کی خدمت میں علی الصباح حاضر ہو جایا کرتا پھر رات ہی میں وہاں سے واپسی ہوتی۔ امام مالک کا یہ معمول سات یا آٹھ سال تک جاری رہا۔ امام طبری نے محمد بن الحسن بن زبالۃ کے حوالہ سے امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں جب ابن ہرمز کے پاس آتا تو ان کے حکم سے ان کی خادمہ دروازہ بند کر دیتی اور پردہ گرا دیتی۔ پھر آپ اس امت کے ابتدائی حالات بیان کرتے اور روتے جاتے یہاں تک کہ آپ کی داڑھی تر ہو جاتی۔ ان واقعات سے امام مالک اور ابن ہرمز کے مابین تعلق کی نوعیت بخوبی واضح ہوتی ہے۔ اس خصوصی تعلق ہی کی بنا پر ابن ہرمز

نے بہت سی راز کی باتیں انھیں بتائیں جن کے لیے وہ کسی اور کو موزوں نہیں سمجھتے تھے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ابن ہرمز کے بارے میں ہمیں کتب طبقات سے کوئی بات معلوم نہیں ہوتی اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ امام مالک نے ان سے کتنا استفادہ کیا، موطا کے راویوں میں بھی ان کا نام نہیں آتا۔ البتہ ابن جریر نے ابوجعفر منصور کے خلاف نفس زکیہ (محمد بن عبداللہ) کی بغاوت کے سلسلہ میں ابن ہرمز کا ذکر کیا ہے۔ قدامہ بن محمد لکھتے ہیں کہ ابن ہرمز اور محمد بن عجلان محمد بن عبداللہ کے ساتھ نکلے جب جنگ کا وقت آیا تو ان دونوں نے ایک ایک کمان سنبھال لی۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ لوگوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ اس کام کے لیے بھی موزوں ہیں۔

طبری نے عبداللہ بن برقی کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ جب وہ جنگ ختم ہوگئی تو میں نے عیسیٰ کی فوج کے ایک سپہ سالار کو دیکھا کہ وہ اپنے لشکریوں کے ساتھ ابن ہرمز کی قیام گاہ معلوم کر رہا تھا۔ ہم نے اسے ان کا پتہ بتا دیا۔ وہ اس حال میں ان کے پاس آئے کہ ان کے جسم پر کفنی کپڑے کی قمیص تھی۔ انھوں نے اپنے سپہ سالار کو اس کے ترکی گھوڑے سے اتار کر ابن ہرمز کو اس پر سوار کیا اور انھیں لے کر عیسیٰ کے پاس پہنچے۔ وہ انھیں دیکھ کر خفا نہیں ہوا بس اتنا کہا کہ آپ کی فقہ (دینی بصیرت) نے آپ کو خروج کرنے والوں کا ساتھ دینے سے کیوں نہیں روکا؟ ان کا جواب تھا کہ وہ ایک فتنہ تھا جس نے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا تو میں بھی اس کی زد میں آگیا اس نے کہا واپس چلے جائیے۔ اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن ہرمز اپنے زمانہ میں اپنی فقہی بصیرت کی وجہ سے کس قدر مقبول و معروف تھے کہ انھوں نے کمان محض اس لیے سنبھال لی تھی کہ لوگ آپ کو دیکھ کر اس مہم میں شریک ہوجائیں۔ البتہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ امام مالک کو انھوں نے کون سی راز کی باتیں بتائی تھیں۔ ہم اس وقت تک اس معاملہ میں کوئی قیاسی بات بھی نہیں کہہ سکتے جب تک کہ ابن ہرمز کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں۔

امام مالک کے ایک استاد ابن شہاب زہری متوفی ۱۲۴ھ ہیں اپنے زمانہ میں مدینہ کے بڑے علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حدیث کے ابتدائی تدوین کاروں میں بھی ان کا شمار ہے۔ شام کے اموی علماء میں آپ کا خاص مقام تھا آپ نے وہاں ایک عرصہ تک قضا و افتاء کی ذمہ داریاں ادا کیں۔ جب آپ مدینہ آئے تو طالبان دین کا ایک جم غفیر آپ کے گرد اکٹھا ہوگیا۔ امام مالک بھی اسی گروہ میں شامل تھے۔ موطا میں ان سے مروی ایک سو تیس احادیث ہیں۔ ان میں سے بانوے احادیث بالاسناد ہیں اور باقی منقطع اور مرسل ہیں۔

امام مالک کے دوسرے استاد ربیعہ بن ابو عبدالرحمٰن متوفی سنہ ۱۳۶ھ ہیں امام مالک کہتے ہیں کہ ربیعہ کے انتقال کے بعد فقہ کی حلاوت جاتی رہی۔ سوار بن عبداللہ کی رائے ہے کہ میں نے ربیعہ سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ امام مالک ان کی مجلس میں شریک ہوتے اور ان سے حدیث کی روایت کرتے۔ لیث بن سعد کا بیان ہے کہ امام مالک بعض وجوہ سے ربیعہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ امام مالک کو ربیعہ کے مجلس کی بعض باتیں ناگوار گزرتیں یہاں تک کہ وہ ان سے علیٰحدہ ہو جانے پر مجبور ہوئے۔ لیث بن سعد کا یہ بیان اس بات کی دلیل ہے کہ امام مالک مجلس ربیعہ سے علیٰحدگی کے وقت بچے نہیں تھے بلکہ عمر کی اس منزل کو پہنچ چکے تھے کہ ربیعہ کے بعض خیالات سے اختلاف کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ایسا وہی شخص کر سکتا ہے جو فکری اعتبار سے پختگی کی منزل تک پہنچ چکا ہو اور اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک طویل مدت تک ربیعہ کی مجلس میں حاضر ہوتے رہے۔ چنانچہ موطا میں امام ربیعہ سے مروی کل بارہ احادیث ہیں۔ جن میں پانچ مسند ہیں ایک مرسل ہے اور چھ روایات وہ ہیں جن کی اسناد متصل نہیں ہیں۔

امام مالک نے حضرت نافع مولیٰ عبداللہ بن عمر متوفی سنہ ۱۲۰ھ سے بھی احادیث کی روایت کی ہے۔ حضرت نافع کی فضیلت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے انھیں اہل مصر کو قرآن و سنت کی تعلیم کے کام پر مامور فرمایا تھا وہ اپنی دینی بصیرت کی وجہ سے فقیہ مدینہ کے لقب سے مشہور تھے۔ امام مالک جب ان کے حلقہ درس میں شامل ہوئے اس وقت پختہ عمر کے نوجوان تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب نافع عن ابن عمر کی سند سے کوئی حدیث سن لیتا تو پھر مجھے کسی اور سے اس روایت کی تصدیق و توثیق کی فکر نہ ہوتی۔ محدثین کہتے ہیں کہ مالک عن نافع عن ابن عمر کی سند سے مروی احادیث اپنے راویوں کی عظمتِ شان کی وجہ سے سلسلۃ الذہب (سنہری کڑی) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ امام مالک نے موطا میں ان سے مروی اسّی احادیث نقل کی ہیں۔

مورخین کا بیان ہے کہ امام مالک کے ایک استاد امام جعفر صادق بھی تھے۔ امام جعفر کا شمار شیعی علما میں ہوتا ہے۔ وہ علمی و دینی حیثیت سے مدینہ کے بڑے علما میں شمار ہوتے تھے۔ شیعہ حضرات ان کے واسطے سے بہت سی احادیث بیان کرتے ہیں جو شیعی کتابوں ہی میں ملتی ہیں۔ ان احادیث کے لیے علامہ مجلسی کی بحار الانوار اور قاضی نعمان بن محمد بن حیون

المغربی کی تالیف دعائم الاسلام کا مطالعہ کافی ہوگا ۔ ان کے معتقدین نے ان احادیث کے انتساب ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ علم کیمیا کی متعدد تصانیف اور فلکیات، ریاضیات اور جفر وغیرہ علوم پر مبنی متعدد تالیفات بھی ان سے منسوب کی ہیں ۔ لیکن اکثر محققین کی رائے یہ ہے کہ ان کی طرف منسوب روایات و تالیفات کا جو ذخیرہ ہے وہ ابھی ثبوت و استدلال کا محتاج ہے ۔ چنانچہ محدثین کے نزدیک امام جعفر کی شخصیت کی دو مختلف تصویریں ہیں ۔ ایک تصویر تو عالم و زاہد امام کی ہے جو علماء اہل سنت اور معتدل مورخین کے یہاں نظر آتی ہے اور دوسری تصویر وہ ہے جو غلو کرنے والے شیعوں نے پیش کی ہے اور اس کی انتہائی شکل ابو الخطاب اسدی کے یہاں نظر آتی ہے ۔ جس سے خود شیعہ کتابوں کے مطابق امام جعفر صادق نے بھی اظہار برأت کیا تھا اور اسے قابل گردن زدنی قرار دیا تھا ۔ امام جعفر کی نسبت یہ بات معروف ہے کہ انھوں نے شیعوں کی برپا کی ہوئی سیاسی تحریکات میں کبھی حصہ نہیں لیا ۔ اور نہ ہی انھوں نے اپنی امامت و قیادت کا کبھی دعویٰ کیا ۔ بلکہ وہ امویوں اور عباسیوں کے ارباب حل و عقد سے مصالحت کو ترجیح دیتے تھے ۔ اسماعیلی فرقہ کا مورخ ادریس اپنی کتاب عیون الاخبار کی جلد چہارم میں یہ واقعہ بیان کرتا ہے کہ ابو مسلم خراسانی نے ایک مرتبہ امام جعفر کے پاس ایک قاصد اس درخواست کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنی امامت و قیادت کا اعلان کر دیں ۔ امام صادق نے خط پڑھتے ہی اسے چاک کر دیا اور قاصد کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ ابو مسلم سے بلا کم و کاست بیان کر دینا ۔ اس واقعہ کی صحت و سقم سے قطع نظر اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امام جعفر صادق کو حکومت اور دنیوی سربراہی کی مطلق خواہش نہ تھی ۔ آپ کی سیرت کا جب یہ حال ہو تو یہ بات بعید نہیں کہ اہل سنت علماء میں سے کسی عالم نے ان سے استفادہ کیا ہو ۔ اگر صاحب دیباج کی یہ روایت صحیح ہے کہ امام مالک نے فلکیات و ریاضیات پر بھی بعض کتابیں لکھی ہیں تو اس کا قوی امکان ہے کہ انھوں نے امام جعفر سے یہ علوم سیکھے ہوں گے ۔ انھوں نے موطا میں ان سے نو احادیث روایت کی ہیں جن میں سے پانچ متصل الاسناد ہیں گرچہ وہ سب ایک ہی حدیث کی مختلف روایتیں ہیں اور وہ ہے حج کے سلسلہ میں حضرت جابر کی طویل حدیث ۔ بقیہ چار احادیث منقطع ہیں ۔

امام مالک نے ان مشہور و معروف علماء کے علاوہ حج کے لیے حجاز آنے والے

علما کی ایک کثیر تعداد سے فیض اٹھایا اور ان سے احادیث کی روایت بھی کی۔ انھوں نے طلب علم کے لیے کوئی سفر نہیں کیا جبکہ علمی اسفار اس زمانہ کے اہل علم خاص طور پر محدثین کی زندگی کا لازمہ تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ بعض دیگر علما کی طرح ان کا بھی یہ خیال رہا ہو کہ علم تو دراصل مدینہ کا علم ہے یعنی وہیں کا علم مستند ہے۔ لیث ابن سعد کہتے ہیں کہ "مجھے کچھ کہتے ہوئے اندیشہ محسوس ہوتا ہے اس لیے کہ لوگ میرے فتووں پر اعتماد کرتے ہیں۔ وہ دین کے معاملے میں اہل مدینہ کے تابع ہیں اس لیے کہ مدینہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی طرف ہجرت ہوئی، وہیں قرآن مجید نازل ہوا، اسی سرزمین کو رسول کریم کی اقامت گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے"۔ اسی لیے امام مالک نے کسی علمی سفر کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس وقت تک اہلِ مدینہ کا علم مستند، بے میل، قطعی اور صحیح تھا۔

سیاسی و ثقافتی حالات

امام مالک کی زندگی ہی میں عالم اسلام ہیجان انگیز صورت حال سے دوچار ہوا جس کے گہرے اثرات سیاسی، اجتماعی اور علمی معاملات پر مرتب ہوئے۔ ان ہی ایام میں عباسیوں کا دعوائے خلافت سامنے آیا اموی حکومت کا زوال ہوا اور عباسیوں کو حکومت واقتدار حاصل ہوا۔ عباسیوں نے امویوں پر بے انتہا ظلم وستم کیے ان کے بے شمار افراد کو قتل کیا۔ ایک حکومت کا خاتمہ اور دوسری حکومت کا قیام فطری طور پر عوام الناس میں اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ لوگوں کی ذہنی اور اجتماعی بے اطمینانی ان کے اندر مختلف قسم کے رویوں کو جنم دیتی ہے۔ کچھ لوگ تقیہ اختیار کر لیتے ہیں ان کے دلوں میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا اظہار نہیں کرتے، کچھ لوگ موجودہ صورتِ حال کو تسلیم کر لیتے ہیں اور جو واقعات رونما ہو رہے ہوں ان کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے تو کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو نئی حکومت سے اظہار وفاداری کو ہی مناسب خیال کرتے ہیں تاکہ انھیں دربار کا تقرب حاصل ہو جائے اور چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو قدیم حکومت کے احیاء کی کوششوں میں ممد و معاون بن جاتے ہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں اس صورت حال کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جس وقت عباسیوں کو حکومت ملی اس وقت بھی یہی صورتِ حال پیش آئی۔ عباسیوں کو امویوں کی طرف سے اس قدر اندیشہ نہیں تھا جتنا وہ علویوں کو اپنے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ سارا

خطہ حجاز بالخصوص مدینہ علویوں کا مرکز تھا۔ مشہور شیعی امام جعفر صادق کا تعلق وہیں سے تھا۔ یہیں سے محمد بن عبداللہ (نفس زکیہ) نے ۱۴۵ھ میں خروج کیا علماء مدینہ کی ایک تعداد بھی ان کے ساتھ تھی جن میں امام مالک کے ایک استاد ابن ہرمز بھی شامل تھے۔ البتہ امام مالک اس خروج میں کوئی مثبت کردار ادا نہ کرنے کے لیے خود کو مجبور ومعذور پاتے تھے اس کا سبب یہ تھا کہ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے امام مالک کو بنوحسن کے پاس جانے والے وفد کے ساتھ بھیج دیا تھا کہ وہ عبداللہ کے دونوں صاحبزادوں محمد اور ابراہیم کو خلیفہ کے حوالہ کردیں لیکن جب محمد اور ابراہیم نے علم بغاوت بلند کردیا تو امام مالک کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ اس اقدام میں ان کا ساتھ دیتے اس لیے کہ کل وہی ان دونوں کو خلیفہ کے حوالے کرنے کے لیے قاصد بن کر گئے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ منصور کے حامی تھے بلکہ وہ اس کے ظلم وزیادتی کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ جب اہلِ مدینہ ان سے سوال کرتے کہ کیا محمد کے ساتھ بغاوت میں شریک ہونا صحیح ہے۔ جبکہ وہ ابوجعفر منصور کی خلافت کو تسلیم کرچکے ہیں تو ان کا جواب ہوتا کہ تم نے حالت جبر میں بیعت کی ہے اور کسی مجبور کیے ہوئے شخص پر کسی عہد کی پاسداری شرعًا ضروری نہیں ہے۔

اس سیاسی اتھل پتھل کی بنا پر امام مالک نے امور سے لاتعلق ہوگئے۔ سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ امام صاحب انتہائی صاحب مروت، بہت زیادہ خاموش رہنے والے، کم گو، اپنی زبان کی حفاظت کرنے والے اور لوگوں کی خاطر مدارات میں سب سے آگے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود انھیں عباسیوں کے عتاب کا شکار ہونا پڑا اور انھیں کوڑوں کی سزا دی گئی اس تعذیب کی وجہ کیا تھی اس کے بارے میں تاریخی بیانات مختلف ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ نفس زکیہ کے خروج کے معاملہ میں انھوں نے جو فتویٰ دیا تھا وہی فتویٰ اس تعذیب کا سبب بنا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ منصور نے انھیں عہدۂ قضا کی پیشکش کی تھی جسے انھوں نے قبول نہیں کیا آپ کے اس انکار کو حاکم کے ساتھ عدم تعاون پر محمول کیا گیا اور آپ کو سزا دی گئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ منصور نے انھیں حکم دیا تھا کہ وہ طلاق مکرہ والی حدیث کی روایت نہ کریں آپ نے اس کے حکم کو تسلیم نہیں کیا چنانچہ اس کی تعذیب کا شکار ہوئے۔ امام مالک کے ایک شاگرد یحییٰ بن بکیر کہتے ہیں کہ امام صاحب کو حضرت علی پر حضرت عثمان کی تفضیل کی وجہ سے یہ سزا دی گئی۔ طالبیوں

کی چغل خوری کی وجہ سے آپ اس عتاب کا شکار ہوئے۔ قدماء نے ابن بکیر کے اس قول کو مسترد کیا ہے۔ جب ابن بکیر سے یہ کہا گیا کہ آپ نے اصحاب مالک سے اس معاملہ میں اختلاف کیا ہے تو وہ کہنے لگے کہ میں ان کے اصحاب سے زیادہ باخبر ہوں۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابن بکیر سے چوک ہوئی ہے۔ اس لیے کہ منصور کے زمانہ میں طالبیوں کا اس قدر عمل دخل نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی کو اس طرح کے معاملہ میں سزا دلوا سکیں اور یہ بات بھی قابل تسلیم نہیں ہے کہ ترجیح عثمانؓ کا معاملہ عباسیوں کی ناراضگی کی وجہ بن جائے گا۔ وہاں تو صورت حال بالکل برعکس تھی۔ عباسی حکمراں حضرت علیؓ کے فضائل کو کم کرکے دکھانا اور دوسرے صحابہ کو ان پر فوقیت دینا چاہتے تھے۔

اس معاملہ میں نفس زکیہ کے نام ابوجعفر منصور کے اس خط کا مطالعہ کافی ہوگا جس میں فضائل علیؓ کے بارے میں منصور کے تنقیصی رویے اور دیگر اصحاب کی ترجیح کا رویہ سامنے آتا ہے۔ منصور نے انھیں لکھا تھا کہ آپ نے حضرت علی کی نسبت جو فخریہ کلمات کہے ہیں تو اس کی حقیقت اس سے واضح ہوتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مرض وفات میں مبتلا ہوئے تو آپؐ نے حضرت علی کے علاوہ دوسرے کو امامت کا منصب سونپا۔ پھر لوگوں نے خلافت کے لیے یکے بعد دیگرے دوسروں کو منتخب کیا۔ تیسرے مرحلہ میں وہ چھ اصحاب شوریٰ میں شامل کیے گئے اس موقع پر بھی انھیں منتخب نہیں کیا گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن کو اختیار دیا گیا تو انھوں نے بھی حضرت عثمانؓ کو ان پر فوقیت دی، شہادت عثمانؓ کے سلسلے میں ان پر تہمت لگی۔ ان سے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے جنگ کی۔ سعد نے ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی اور گھر کا دروازہ بند کرکے بیٹھ رہے۔ یہاں تک کہ ان کے بعد حضرت معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ انھوں نے ہر ممکن طریقہ سے خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے جنگ کی۔ خود ان کے ساتھی ان سے جدا ہوگئے اور حکومت سے قبل ان کے اصحاب بھی انھیں شک کی نظر سے دیکھتے رہے” وغیرہ۔ جب ابوجعفر منصور کا رویہ حضرت علیؓ اور علویوں کے بارے میں اس قسم کا تھا تو وہ طالبیوں کی اس شکایت کو کیوں کر قبول کرتا کہ امام مالک حضرت عثمانؓ کو حضرت علی پر فوقیت دیتے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ لیث بن سعد کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور امام مالک دونوں حضرت عثمان کی افضلیت کے قائل تھے۔ امام مالک نے

حضرت علی سے کوئی حدیث بھی روایت نہیں کی ان سے جب اس کا سبب معلوم کیا گیا تو فرمایا کہ وہ مدینہ میں موجود نہیں تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی اس رائے کی وجہ سے آزمائش میں ڈالے گئے۔ چنانچہ ہمارے لیے یحییٰ بن بکیر کی مذکورہ بالا روایت کو تسلیم کرنا ممکن نہیں۔ ہم تو طلاق مکرہ (زبردستی کی طلاق) والی روایت ہی کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی حقیقت ہے کہ امام مالک اور عباسیوں کے مابین تعلقات بہت جلد پائیدار ہو گئے تھے۔ عباسی ان سے اور دیگر علماء وقت سے قربت کو اپنی حکومت کے استحکام کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان میں بعض خلفاء آپ کی خدمت میں حاضری بھی دیتے تھے۔ مہدی عباسی نے ان سے موطا کی روایت کی ہے۔ امام مالک اور عباسی خلفاء کی باہمی ملاقاتوں کے متعدد واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عباسیوں نے اس جلیل القدر عالم کی بڑی قدر افزائی کی۔ بہت زیادہ ہدایا اور تحائف دیئے اور حاکم مدینہ کے مساوی انھیں اقتدار بخشا آپ جس کی گرفتاری کا حکم دیتے وہ گرفتار ہو جاتا اور جس کو قابل تعزیر قرار دیتے وہ سزا پاتا۔ اس سب کے باوجود امام مالک عباسیوں کی مکمل تائید و حمایت نہیں فرماتے تھے اس لیے کہ ان کے نزدیک اسلامی حکومت کا مثالی نمونہ تو حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکومتیں تھیں اور آپ اس بات کے متمنی رہتے کہ مسلمانوں کو ان ہی جیسا کوئی حکمراں نصیب ہو۔

علمی و فکری اعتبار سے دیکھئے تو دنیائے اسلام کے ہر خطہ میں مسلمانوں نے دینی تعلیمات کی تدریس و اشاعت میں قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ انھوں نے قرآن مجید کی خدمت متعدد جہات سے کی اس کی تفسیر، اس کی قراءتوں اور مفرد الفاظ پر قابل لحاظ کام ہوا۔ اس کے پہلو بہ پہلو رسول کریم کی احادیث کی بھی مختلف حیثیتوں سے حفاظت و اشاعت کا کام انجام پایا۔ رسول کریم کے اسوہ اور ان کی تعلیمات کی تحقیق و تفتیش ہوئی۔ صحابہ کی ایک بڑی تعداد جب جہاد کے لیے نکلتی تو لوگ ان کے گرد اکٹھا ہو جاتے اور ہر جماعت میں ایسے افراد ہوئے جو لوگوں کو قرآن و سنت کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس طرح کی کوششوں کے باوجود صحابہ کے مابین بھی آراء کا اختلاف ہوا۔ پھر تابعین اور تبع تابعین کے درمیان بھی فقہی اختلافات موجود رہے۔ اسی صورت حال کا ذکر لیث بن سعد امام مالک

سے ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ "پھر ان کے (یعنی صحابہ و تابعین کے) بعد لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ میں ان سب کی خدمت میں حاضر ہوا مدینہ میں بھی اور دوسرے شہروں میں بھی ان میں سرفہرست ابن شہاب اور ربیعہ بن ابو عبدالرحمٰن تھے۔ امام مالک بعض وجوہ سے ربیعہ کے مخالف تھے۔ مجھے وہ وجہ معلوم تھی اور میں آپ سے اس کے بارے میں سن چکا تھا۔ اہل مدینہ میں سے یحییٰ بن سعید عبیداللہ بن عمر اور کثیر بن فرقد جیسے اصحاب رائے کے موقف سے بھی باخبر تھا جو سب کے سب ان سے عمر میں بڑے تھے۔ یہاں تک کہ آپ ربیعہ کی مجلس کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئے پھر میں نے آپ سے اور عبدالعزیز بن عبداللہ سے ربیعہ کی ایسی باتیں بھی ذکر کی تھیں جنھیں میں ناپسند کرتا تھا تو آپ دونوں نے میری رائے سے اتفاق کیا آپ دونوں ہی ان چیزوں کو ناپسند کرتے تھے جو مجھے پسند نہیں تھیں۔" لیکن وہ فقہی اختلافات جن کا ذکر لیث بن سعد کے یہاں ملتا ہے۔ صرف مدینہ ہی تک محدود نہ تھے بلکہ عالم اسلام کے تمام خطوں میں اس قسم کے اختلافات پائے جاتے تھے۔ اور اسی اختلاف کی وجہ سے وہ فکری سرمایہ وجود میں آیا جس کی نظیر کسی اور مذہب یا تہذیب میں نہیں ملتی، مسلمانوں کو ایسا علمی و فکری ورثہ میسر آیا جو ان کی زندگی و بقا کا ضامن بنا۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ امام مالک ہی کے زمانہ میں مذکورہ دینی علوم میں بعض ایسے علوم کی بھی آمیزش ہوئی جو مسلمانوں اور عربوں کے لیے اجنبی تھے۔ جس کی بنا پر ان علوم کی نوعیت میں نئے قسم کی تبدیلی رونما ہوئی اور ایسا اس وقت ہوا جب عجمی ممالک میں لوگوں کی بڑی تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی۔ اسلام لانے سے پہلے ان کا مخصوص فکری و دینی پس منظر تھا۔ اور ان کی کچھ ایسی عادات و اوصاف تھیں جو عربوں اور مسلمانوں کے لیے نامانوس تھیں۔ پھر ایسا ہوا کہ اموی عہد میں دیگر علوم و آداب کے ترجموں کی ایک تحریک شروع ہوئی جس کے نتائج عباسی عہد میں رونما ہوئے۔ چنانچہ نفسانی خواہشات اور بدعتوں کا ظہور ہوا اور طرح طرح کے فرقے وجود میں آئے اور ان کے درمیان مناظرے اور اختلافات شروع ہو گئے۔ چنانچہ شیعہ خوارج، قدریہ، مرجئہ اور معتزلہ جیسے فرقے بن گئے خلیفہ منصور کے زمانہ میں خراسانی، رواندی اور زنادقہ جیسے غالی فرقے سامنے آئے۔ اس سب کے باوجود حجاز کا ماحول ان دینی اختلافات و آلودگیوں سے بڑی حد تک پاک تھا اور اہل مدینہ نے ان دینی وراثتوں کو اپنی اصل شکل میں باقی رکھا جو وہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے موجود تھیں۔ چنانچہ وہاں مذہبی مناظروں کے فروغ کی گنجائش نہ رہی بلکہ دین کی حفاظت اور اس

کی اشاعت ہی کا کام انجام پایا۔ اسی لیے لوگ دینی معاملات میں اہلِ مدینہ کی آرار کو ترجیح دیتے تھے۔ خود امام مالک کے نزدیک بھی مدینہ کو یہ امتیازی مقام حاصل تھا، لیث بن سعد اور امام مالک کے شاگردوں کی رائے بھی یہی تھی۔

مسلک

امام مالک ان گمراہ فرقوں کے حاملین اور نفس پرست قائدین سے بے زار تھے۔ ان کے اقوال و آرار کی کمزوریاں واضح کرتے۔ ان کے سامنے جب اس طرح کے کسی شخص کا ذکر ہوتا تو وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ قول سنایا کرتے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفار نے جو نمونہ چھوڑا ہے اس کی پیروی ہی دراصل کتاب اللہ کی پیروی اطاعت الٰہی کی تکمیل اور اللہ کے دین کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ کسی انسان کو اس میں تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ اس سے مخالف کسی شے کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جو شخص اسے اختیار کرے گا وہ راہ یاب ہے اور جو اس کے ذریعہ نصرت کا خواہاں ہوگا اس کی مدد ہوگی اور جو اسے چھوڑ بیٹھے گا وہ مومنین کی راہ سے ہٹ جائے گا اور اللہ اسے اسی راہ پر چلائے گا جسے اس نے اختیار کیا ہے پھر وہ جہنم کا ایندھن بنے گا اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔" یہ تھا گمراہ فرقوں کے بارے میں امام مالک کا موقف۔ چنانچہ وہ قرآن وسنت سے وابستگی، خلفائے راشدین، صحابہ اور مدینہ کے اصحاب علم وتقویٰ کے اقوال پر اعتماد ہی کو دین سے صحیح وابستگی قرار دیتے تھے۔ اور وہ خود بھی اسی مسلک پر عامل تھے۔ ان کی تالیف الموطا ان کے اسی مسلک کی واضح دلیل ہے۔ امام مالک کے ایک شاگرد ابن ابی اویس کہتے ہیں کہ امام مالک سے یہ سوال کیا گیا کہ موطا میں آپ جب یہ فرماتے ہیں کہ یہ بات متفق علیہ ہے (الامر المجتمع علیہ) یا یہ مسئلہ ہمارے نزدیک یا ہمارے شہر میں معتبر ہے (الامر عندنا وبلدنا) اور میں نے اہلِ علم کو پایا ہے (ادرکت اہل العلم) اور میں نے بعض اہل علم سے سنا ہے (سمعت بعض اہل العلم) تو ان بیانات کا کیا مطلب ہے؟ امام مالکؒ نے فرمایا کہ اس کتاب میں جو بات میں نے اپنی رائے کی حیثیت سے بیان کی ہے وہ درحقیقت تنہا میری رائے نہیں ہے بلکہ وہ متعدد اصحاب علم وفضل کی بھی رائے ہے اور ان حق پرست ائمہ کا بھی مسلک ہے۔ ان ہی سے میں نے وہ رائے اخذ کی ہے وہ سب کے سب اصحاب تقویٰ

وتدین تھے۔ ان افراد کا ذکر طوالت کا موجب ہوتا ہے اس لیے میں نے اسے اپنی رائے کہنے پر اکتفا کیا اور وہ رائے میری بھی اس لیے ہے کہ ان کی رائے صحابہ ہی کی رائے ہے انھوں نے بھی صحابہ کو اس پر عامل دیکھا اور میں نے بھی انھیں اس پر عامل دیکھا ہے تو گویا یہ ایک علمی ورثہ ہے جو نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا ہوا ہمارے زمانہ تک پہنچا ہے اور جس کا ذکر محض رائے کی حیثیت سے ہے تو وہ بھی ائمہ سلف کی ایک جماعت کی رائے ہے اور جس کا ذکر امر مجتمع علیہ کی حیثیت سے ہوا ہے تو وہ قول ہے جس پر اہل فقہ اور اہل علم کا اجتماع ہو گیا ہے۔ اور الامر عندنا کا مطلب وہ عمل ہے جس پر ہمارے سامنے لوگوں نے عمل کیا اور اسی کے مطابق فتوے دیے جاتے ہیں اور عالم وجاہل سب کے نزدیک وہ ایک معروف عمل بن گیا ہو اور یہی مفہوم الامر ببلدنا کا ہے اور جہاں میں نے بعض اہل علم کا ذکر کیا ہے تو اس سے مراد وہ اقوال ہیں جو مجھے علماء کے اقوال سے مستحسن معلوم ہوئے اور جن مسائل میں میں نے ان سے نہیں سنا ان کے سلسلہ میں اجتہاد سے کام لیا اور جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان کے مسلک پر غور وخوض کرنے کے بعد حق سے قریب تر رائے میں نے اختیار کی اور اس کا خیال رکھا کہ وہ رائے اہل مدینہ کے مسلک وآراء سے متصادم نہ ہو اور اگر میں نے کوئی رائے کسی سے نہیں سنی تو اس پر سنت اور علماء سلف کے عمل کی روشنی میں میں نے خود اجتہاد کیا اور اس رائے کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ البتہ رسول کریم اور خلفائے راشدین کے عہد سے جو امور معمول بہا رہے ہیں تو ان سے میں نے اپنا قدم باہر نہیں نکالا۔"

امام مالک کے اس طریقہ کار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ علمی روایت کے منتقل کرنے کے معاملہ میں اپنے ہم عصر علماء کی طرح تھے۔ البتہ ان کی روایتوں کے ماسوا ان کی تشریحات و تعبیرات انھیں ایک طرف تو بڑے مرتبہ کا راوی بناتی ہیں تو دوسری طرف وہ ایک اعلی پایہ کے مجتہد ٹھہرتے ہیں۔ انھوں نے احادیث نبوی کے علاوہ مجتہدین کی آرا اور علماء اہل مدینہ کے اقوال کی روایت بھی کی اس کے باوجود وہ کسی حدیث کو اختیار کرنے میں مجتہدانہ بصیرت سے کام لیتے اور اس معاملہ میں اس قدر محتاط تھے کہ امام شافعی جیسے فقیہ کی رائے یہ تھی کہ امام مالک کو اگر کسی حدیث کے بارے میں ذرا بھی شک ہو جاتا تو وہ پوری حدیث ہی ان کے نزدیک پایۂ اعتبار سے گر جاتی۔ ابن ابی اویس کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک کو فرماتے سنا کہ یہ علم درحقیقت دین ہے اس لیے تمھیں یہ دیکھنا چاہیے کہ تم کس طرح کے لوگوں سے اسے

حاصل کر رہے ہو۔ میں نے اس مسجد (مسجد نبوی) میں ستر کے قریب افراد کو قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے سنا ہے (حدیث رسول بیان کرتے ہوئے) مگر میں نے ان سے ایک حدیث بھی نہیں لی۔ حالانکہ اگر انھیں کسی بیت المال کا امین بنا دیا جاتا تو وہ اپنے کو اس کا اہل ثابت کرتے مگر وہ اس فن کے لوگ نہ تھے۔"

علم وفضل

امام مالک سے جو مسائل پوچھے جاتے ان کے بارے میں آپ بہت زیادہ غور وفکر اور اجتہادی دقت نظر سے کام لیتے۔ ابن القاسم بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے یہ بات سنی ہے وہ فرماتے تھے کہ دس سال سے زائد ہو گئے کہ ایک مسئلہ پر غور کر رہا ہوں مگر اب تک میں کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میرے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوتا ہے اور میں اس پر غور کرتے ہوئے پوری رات گزار دیتا ہوں۔ ان بیانات سے یہ بات واضح ہے کہ امام مالک بہت غور وفکر سے کام لیتے تھے اور مسائل میں دقت نظر کے ساتھ اور طویل غور وفکر کے بعد ہی کوئی رائے قائم کرتے تھے۔ آپ سے جو مسئلے پوچھے جاتے ان پر رائے دیتے وقت وہ اللہ سے ڈرتے بھی ہوتے کیونکہ وہ اللہ کے دین کے معاملہ میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم ان کے اس قول سے ابھی واقف ہو چکے ہیں کہ یہ علم، دین کا معاملہ ہے تو تمہیں یہ ضرور دیکھنا چاہیئے کہ تم کس قسم کے لوگوں سے اسے حاصل کر رہے ہو۔ چنانچہ یہ کسی حیرت اور تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہمارے اسلاف امام مالک کی مروی احادیث پر مکمل اعتبار و اعتماد کرتے تھے وہ امام مالک کو ثقہ راوی کی حیثیت دیتے تھے اور خود ان کے شیوخ پر انھیں فوقیت دیتے تھے۔ ابن عبد الحکم کا بیان ہے کہ امام مالک یحییٰ بن سعید، ربیعہ اور نافع کے زمانے میں فتوے دیا کرتے تھے اور امام مالک کا حلقہ درس نافع کے حلقہ درس سے بھی بڑا تھا"۔ یہ امام مالک کے معاصرین کی جانب سے نافع پر ان کی فوقیت اور برتری کا کھلا ہوا اعتراف ہے جبکہ حضرت نافع کا علم وفضل اور ان کے مرتبہ کی بلندی ایک مسلم الثبوت حقیقت تھی وہ فقیہ مدینہ کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے ان کے معاصرین نے انھیں جو فضیلت کا مقام دے رکھا تھا اور ان سے استفادہ کی خاطر آپس میں ان کی جو مسابقت ہوا کرتی تھی اس وجہ سے بھی ابن اسحاق اور ابن ابی ذیب

جیسے بعض علماء نے بربنائے حسد ان کے بارے میں بعض نامناسب باتیں کہی ہیں۔ ان کے بغض ونفرت کا دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ امام مالک ان سے اختلاف رکھتے تھے اور بعض معاملات میں ان پر طعن کرتے تھے۔ ان سب کے باوجود امام مالک پر معترض یہ علماء بھی امام مالک کی روایت کردہ کسی حدیث پر کسی تنقید واعتراض کی جرات نہیں کرسکے۔ ان کے اعتراضات کا نشانہ امام مالک کی فقہی آراء بنتی تھیں یا پھر امام کے بعض خاص معمولات مثلاً نماز باجماعت سے ان کی غیر حاضری یا جنازہ کی نماز یا مریض کی عیادت کے لیے نہ جانا جبکہ وہ امراء کی زیارت کیا کرتے تھے حالانکہ یہ باتیں آپ کی زندگی کے آخری ایام کی ہیں جبکہ آپ کافی بوڑھے ہوچکے تھے۔ چنانچہ امام مالک سے منسوب یہ باتیں آپ کی علمی شان ومنزلت کو کم نہیں کرتیں اور نہ ہی ان کی روایت کی صحت میں خلل انداز ہوتی ہیں۔

مؤطا کی تصنیف

الموطا کو صحت حدیث کے اعتبار سے امتیازی درجہ حاصل ہے اس لیے کہ وہ حدیث کے اولین مجموعوں میں شمولیت کا اعزاز رکھتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جب احادیث نبوی کی تدوین کا ارادہ کیا اور صحابہ کرام سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا تو انھوں نے آپ کے اس ارادے کی تائید کی تھی اس کے باوجود وہ اپنے اس ارادہ پر محض اس اندیشہ سے عمل نہ کرسکے کہ کہیں لوگ قرآن و حدیث میں التباس کا شکار نہ ہوجائیں۔ اس طرح صحابہ کرام نے بھی عموماً احادیث کے لکھنے کا اہتمام نہ کیا وہ انھیں اپنی یادداشت میں محفوظ رکھتے اور حفظ کی بنیاد پر ہی وہ دوسروں تک منتقل کرتے۔ البتہ کچھ صحابہ احادیث کو لکھ لیا کرتے تھے۔ امام بخاری نے کتاب العلم میں ابوہریرہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ " اصحاب رسول میں سے کوئی بھی مجھ سے زیادہ حدیثیں بیان کرنے والا نہ تھا سوائے عبداللہ بن عمرو کے کہ وہ حدیثیں لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانے میں مختلف شہروں میں حدیث اور فقہ کی تعلیم کے لیے ہدایات جاری کی تھیں اور علماء مدینہ کو بطور خاص اس کی تاکید کی تھی۔ انھوں نے ابوبکر بن محمد بن حزم کو بھی حکم دیا تھا کہ انھیں رسول کریم کی جو احادیث بھی مل جائیں یا حضرت عمر کے جو اقوال ملیں وہ انھیں سب کو لکھ کر محفوظ کرلیں تاکہ حفاظ کے اٹھ جانے سے ان کے ضیاع

کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ یہ سب تدوین حدیث نبوی کی ابتدائی مثالیں تھیں، امام سیوطی نے تنویر الحوالک میں لکھا ہے کہ " احادیث کی تدوین وتبویب کا سلسلہ تابعین کے آخری زمانہ میں شروع ہوا جبکہ علماء مختلف شہروں میں پھیل گئے اور خوارج اور روافض اور منکرین تقدیر نے بے شمار بدعتیں ایجاد کر لی تھیں۔ اس وقت جن لوگوں نے احادیث کو موضوعاتی اعتبار سے جمع کرنے کا اہتمام کیا ان میں ربیع بن صبیح اور سعد بن ابی عروبہ وغیرہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ پھر دوسری صدی ہجری کے نصف میں طبقہ ثالثہ (تیسرے طبقہ) کے علماء نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور انھوں نے احکام دین کی تدوین کی چنانچہ امام مالک نے بھی الموطا تصنیف کی اور اس میں اہل حجاز کی قوی احادیث جمع کیں اور اقوال صحابہ اور تابعین و تبع تابعین کے فتاوی بھی درج کیے۔ چنانچہ امام مالک کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے صحیح احادیث کی تدوین میں اولیت کا شرف حاصل کیا اور روایتوں کے قبول کرنے میں حد درجہ احتیاط ملحوظ رکھی۔ حدیث کے متن اور سند دونوں کی بڑی باریک بینی کے ساتھ چھان پھٹک کی۔ ابن عیینہ کہتے ہیں میں نے علم کے حصول میں امام مالک سے بہتر اور بلند پایہ کوئی شخص نہیں دیکھا اور نہ ہی رجال حدیث اور علماء روایت پر نقد کرنے کے معاملہ میں ان سے سخت کوئی آدمی پایا۔" امام مالک غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے فن حدیث کو وضع کیا اس لیے کہ ان سے پہلے کسی ایسے عالم کا ذکر نہیں ملتا جس نے راویوں پر نقد کی بات کی ہو یا راویوں اور علماء کی روایات واقوال کو قبول کرنے میں سخت گیر اصول اپنائے ہوں۔ امام مالک نے مسائل فقہیہ کے سلسلہ میں بھی وہی طریقہ اپنایا ہے جو روایات کے سلسلہ میں ان کے یہاں نظر آتا ہے۔ ان کی موطا، حدیث، تفسیر فقہ اور تاریخ جیسے علوم ومباحث کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس وقت تک علوم کی وہ حد بندی نہیں ہوئی تھی جو آج ہمیں نظر آتی ہے۔ طبری نے عباس بن ولید اور ابراہیم بن حماد کے واسطے سے امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ان سے خلیفہ مہدی نے کہا اے ابو عبداللہ کوئی ایسی کتاب تصنیف کیجئے جسے امت کا دستور العمل بنا دیا جائے تو انھوں نے جواب دیا اے امیر المومنین! جہاں تک مغرب کے علاقہ کا سوال ہے تو وہاں آپ کی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ شام میں وہ شخص ہے جس کی عظمت کا آپ کو بھی علم ہے (یعنی امام اوزاعی) رہے اہل عراق تو وہ اہل عراق ہیں (یعنی ہر علاقہ کے افراد کو اپنے علماء کے مسلک پر چلنے کی آزادی ہونی چاہیے) اس روایت سے یہ بات معلوم ہوتی

ہے کہ موطا کی تصنیف خلیفہ مہدی کی تحریک پر عمل میں آئی۔ لیکن طبری ہی کی ایک دوسری روایت اس کے خلاف جاتی ہے۔ یہ محمد بن عمر کی روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک بن انس کو یہ فرماتے سنا کہ جب ابو جعفر منصور حج کے لیے آئے تو انھوں نے مجھے بلایا اور مجھ سے گفتگو کی، مجھ سے کچھ سوالات کیے میں نے ان کے جوابات دئے تو انھوں نے کہا کہ میں نے یہ طے کیا ہے کہ آپ کی اس کتاب کے متعدد نسخے تیار کرا کر بلادِ اسلامیہ میں تقسیم کراؤں اور مسلمانوں کو حکم دے دوں کہ وہ اسی کتاب کو اپنا دستور العمل بنائیں اور اس کے علاوہ تمام احادیث و اقوال سے صرفِ نظر کریں اس لیے کہ میرا خیال یہ ہے کہ صحیح علم صرف اہلِ مدینہ ہی کا علم ہے۔ میں نے ان سے کہا امیر المومنین آپ ایسا ہرگز نہ کیجئے اس لیے کہ لوگوں کے پاس نبی کریمؐ کی احادیث اور علماء کے اقوال دوسرے ذرائع سے پہنچ چکے ہیں اور انھیں انھوں نے اپنا دستور العمل بنا لیا ہے اور ان سے یک گونہ قربت بھی ہو گئی ہے اس لیے اب ان کے معتقدات سے انھیں الگ کرنا ایک مشکل کام ہو گا اس لیے لوگوں کو ان کے اپنے حال پر اور اپنے مسلک پر چھوڑ دیجئے انھوں نے کہا کہ بخدا اگر آپ میرے ہم خیال ہوتے تو میں ضرور اس کا حکم دے دیتا۔ ابن جریر طبری نے یہ دوسری روایت بھی جو پہلی روایت کی معارض ہے بغیر اپنا ترجیحی رجحان ظاہر کیے نقل کر دی۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ دونوں ہی روایتیں ناقابلِ قبول ہیں۔ مہدی ۱۵۸ھ میں عباسی خلافت کا وارث ہوا تھا اس وقت امام مالک کی عمر تقریباً ۶۵ سال تھی گویا وہ ان کی زندگی کے آخری ایام تھے۔ مہدی نے دورِ امارت میں امام مالک سے موطا کی روایت کی تھی تو وہ دورِ خلافت میں ان سے اس کتاب کی تصنیف کا مطالبہ کیسے کر سکتا ہے؟ دوسری روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امام مالک کا علم بلادِ مغرب میں ہر جگہ پھیل چکا تھا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ علم وہی علم تھا جو موطا میں مدون ہو چکا تھا یا اس کے علاوہ کوئی اور علم تھا؟ اگر یہ وہی علم ہے جو موطا کی شکل میں مدون ہو چکا تھا تو کیا وہ مدون حالت میں مغرب تک پہنچا یا غیر مدون حالت میں؟ اور نص سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امام مالک نے جتنی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں وہ سب کی سب منصور سے ملاقات سے قبل کی تصنیف شدہ ہیں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا منصور ان تصنیفات سے بے خبر تھا کہ اسے امام مالک سے کتابوں کے نسخے تیار کرانے کا مطالبہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ تمام علاقوں کے لیے انھیں دستور العمل بنا دیا جائے۔ یہ بات معلوم ہے کہ

علمائے عراق کے بارے میں امام مالک کی ایک مخصوص رائے تھی۔ اسی طرح علماء عراق کا بھی امام مالک کے سلسلہ میں ایک متعین موقف تھا۔ پھر کیا منصور عراقی علماء یا دیگر علاقوں کے علماء کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا تھا؟ ممکن ہے کہ منصور اس کی خواہش رکھتا ہو مگر اسے اس بات کا ادراک ہوگیا تھا کہ اس کی یہ خواہش روبعمل نہیں آسکتی۔

اب رہا یہ سوال کہ موطا کی تصنیف کب عمل میں آئی تو اس کا تعین خاصا دشوار ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ دس ہزار احادیث سے منتخب کردہ مجموعہ ہے۔ امام مالک ہر سال اس ذخیرہ احادیث پر نظرثانی کرتے اور اس میں سے کچھ حدیثیں کم کرتے رہے تھے یہاں تک کہ اتنی حدیثیں باقی رہ گئیں جو ہمارے سامنے موطا کی شکل میں موجود ہیں تصنیف کے اس طریق کار سے ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تصنیف میں کئی سال لگ گئے گرچہ سیوطی نے امام مالک کے حوالے سے اس کی مدت تصنیف چالیس سال بتائی ہے۔

علماء کی ایک بڑی تعداد نے امام مالک سے موطا کی روایت کی ہے۔ امام سیوطیؒ کہتے ہیں کہ امام مالک سے روایت کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ کسی دوسرے امام سے اتنے راوی نہیں ہیں۔ ان راویوں نے مختلف شہروں میں فقہ مالکی کی نمائندگی کی مصر میں مالکی مدرسہ امام مالک کی تعلیمات کی اشاعت اور موطا کی روایت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ مصریوں ہی کے واسطے سے مسلک مالکی مغرب اور اندلس میں رائج ہوا۔ اس کے بعد وہاں کے علماء امام مالک سے براہِ راست استفادہ کرنے کے لیے آنے لگے۔ ابن خلدون کہتے ہیں کہ اہلِ مغرب اور اہلِ اندلس میں مسلک مالکی کے رائج ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اکثر و بیشتر حجاز کا سفر کیا کرتے تھے اور وہی ان کے اسفار کی آخری منزل ہوتی تھی اس زمانہ میں مدینہ کو علمی مرکزی حیثیت حاصل تھی اور وہاں سے یہ علم عراق تک پہنچا جبکہ عراق اہل مغرب یا اندلسیوں کے راستہ میں نہیں آتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے علماء مدینہ سے استفادہ پر اکتفا کیا اس زمانہ میں امام مالک ہی علماء مدینہ کے استاذ اور امام تھے۔ امام مالک سے پہلے ان کے اساتذہ سے اور امام مالک کے بعد ان کے شاگردوں سے علمی استفادہ کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ مغرب اور اندلس والے مسلک مالکی کے حلقہ بگوش رہے اور دوسروں کی طرف قطعاً توجہ نہ کی۔

اہلِ تاریخ لکھتے ہیں کہ عبدالملک بن حبیب نے سب سے پہلے اندلس میں مسلک مالکی کی اشاعت کی اور اندلسیوں میں امام مالک کے سب سے مشہور شاگرد کا نام یحییٰ بن

یحییٰ اندلسی ہے جن کے واسطے سے موطا کی روایت زیادہ عام ہوئی اور ان کے علاوہ دوسرے شاگردوں کی روایات کو رواج نہ مل سکا۔ وہ اندلس کی حکومت میں اتنے اثر و رسوخ کے مالک تھے کہ ان کے مشورے کے بغیر کسی کو منصب قضا پر فائز نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ وہاں کے تمام قاضی یا تو ان کے رفیق تھے یا ان کے شاگرد۔ ایسا بلند مرتبہ مصر کے لیث بن سعد کے سوا امام مالک کے کسی شاگرد کو حاصل نہ ہوا لیکن لیث بن سعد خود ایک مجتہد فقیہ کا درجہ رکھتے تھے انھوں نے بعض مسائل میں امام مالک سے اختلاف بھی کیا ہے۔ امام مالک کے نام ان کے خطوط میں یہ اختلافی مسائل مذکور ہیں۔ یحییٰ بن یحییٰ کی روایات کے مشہور ہونے اور دوسروں کی روایات کے باقی نہ رہنے کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب اندلس کی اموی حکومت کا ان کے تئیں ترجیحی رویہ تھا کیونکہ اس حکومت کی یحییٰ بن یحییٰ پر خاص نظر عنایت تھی۔

ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کی نئی پیشکش

ISLAMIC CIVILIZATION IN ITS
REAL PERSPECTIVE

تحریک اسلامی کے معروف عالم دین مولانا صدر الدین اصلاحی مدظلہ کی مایہ ناز تصنیف "معرکۂ اسلام و جاہلیت" کا انگریزی ترجمہ ہے۔ اسلام کی بصیرت افروز آگہی کے لیے جاہلیت سے واقفیت ضروری ہے۔ جاہلی عناصر کس طرح اسلامی تصورات میں اپنی جگہ بناتے ہیں۔ اسلام اور جاہلیت کے درمیان مسلسل کش مکش کا انداز کیا ہے۔ خالص اسلام سے وابستگی کے تقاضے ان امور سے واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔

مترجم ڈاکٹر اسرار احمد خاں نے انتہائی معیاری و دل کش اسلوب میں اسے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے۔ • صفحات ۱۳۷ • قیمت =/۹۰ روپے

ملنے کے پتے:

۱۔ ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ پان والی کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱
۲۔ مرکزی مکتبہ اسلامی۔ ۳۔۱۳۵۳ چتلی قبر، دہلی ۱۱۰۰۰۶